# قانون وضعی میں قانون بین الممالک کا مقام

(اس کی تاریخ اور اس کے اہم اصول......دوسری قسط)

## خاص قانون بین الممالک

﴿۳۴۲﴾ یہ قانون دور حاضر میں وجود میں آیا ہے، تاہم اس کی جڑیں قدیم ہیں، جو بعض ماہرینِ قانون کی رائے میں رومی دور اور ازمنہ وسطیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔(۳۶)

ذرائع ابلاغ و مواصلات کی سہولت اور بین الاقوامی تجارت کے وسیع دائرے کے سبب، دورِ حاضر میں خاص قانون بین الممالک کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

خاص قانون بین الممالک (Public International Law) کے تمام قواعد وضوابط کا دار و مدار شخصی یا مقامی قوانین پر ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کیا یہ قانون اپنے اس اطلاق میں صرف اپنے دائرے میں آنے والے اشخاص پر نافذ ہوگا، اور ان کے علاوہ کسی پر نہیں؟ مثلاً مصری قانون، مصر میں رہنے والے دوسری شہریت کے حامل بیرونی افراد کے بجائے صرف مصری باشندوں پر لاگو ہوگا؟ یا یہ کہ اس قانون کی تنفیذ اس مقام سے مربوط ہوگی جس کی طرف یہ قانون منسوب ہے اس کے اندر دیگر رہنے والوں کونظر انداز کیے بغیر، پس مصری قانون مصر میں موجود تمام باشندوں پر نافذ ہوگا خواہ وہ مصری ہوں یا غیر مصری۔شخصی اور مقامی قوانین کے نظریے کے علاوہ کچھ مسائل ایسے ہیں جنھیں یہ قانون اہمیت دیتا ہے، مثلاً شہریت کا مسئلہ، اس کے حصول کا مسئلہ، ملکی باشندے اور ان کی اقسام اور ان کے علاوہ بہت سے مسائل، جن کے بارے میں تفصیلاً گفتگو کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔(۳۷)

لیکن خاص قانون بین الممالک اور اس کے موضوعات شروع سے اب تک ماہرینِ قانون کے درمیان اختلاف کا باعث رہے ہیں۔ اس کے برعکس عام قانون بین الممالک کے قواعد وضوابط سب کے ہاں متفق علیہ رہے ہیں۔

☆☆

---

(۳۶) القانون الدولی الخاص، ج ۱:۲۷

(۳۷) القانون الدولی الخاص، ج ۱:۲۷

# قانون بین الممالک کے اسلامی اصول

## اسلام میں بین الممالک تعلقات

﴿۳۴۳﴾ اسلام دیگر آسمانی مذاہب سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ عالمی دعوت اور پوری نوع انسانی کے لیے ایک پیغام ہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اسے لے کر مبعوث ہوئے، تاکہ آپؐ انسانوں کو کفر و شرک اور ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر انھیں نورِ اسلام سے منور فرمائیں اور صراط مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کریں۔

اسلام کی یہ عالمگیریت اور آفاقیت ہر اس شخص پر واضح ہو جاتی ہے، جو اس دین کا گہرائی اور انصاف کی نگاہ سے مطالعہ کرتا ہے۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ سے قطع نظر، جو اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ اسلام تمام انسانوں کے لیے ہے، اس کے دائمی معجزے نے کتبِ آسمانی کے نزول پر مہر لگا دی ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول اور نبی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دینِ متین کی تعلیمات بذات خود اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ دین اسلام فی الواقع پوری انسانیت کی طرف ہدایت و خیر کا پیغام ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس پر بسنے والوں کو اس کا وارث بنا دیا ہے۔

اسلام تمام انسانوں کو ایک ہی امت اور ایک ہی برادری قرار دیتا ہے، جو رنگ، نسل اور حسب و نسب کی بناء پر ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتے، بلکہ ان کے درمیان فضیلت و برتری کا معیار تقویٰ اور عملِ صالح ہے۔ اسلام کی نگاہ میں تمام انسان یکساں ہیں، جو کسی تفریق و امتیاز کے بغیر اپنے قانونی حقوق سے متمتع ہوسکتے ہیں۔ اسلام نے واشگاف الفاظ میں بتایا ہے کہ زبانوں اور علاقوں کے اختلاف سے قطعِ نظر انسانوں کے درمیان باہمی تعلق کی بنیاد محبت و

الفت، باہمی تعارف اور خیر ونیکی کے کاموں میں باہمی تعاون پر ہے:

یایھا الناس انا خلقنکم من ذکر وانثیٰ وجعلنکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرم مکم عند اللّٰہ أتقاکم ان اللّٰہ علیم خبیر (لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)۔(۳۸)

﴿۳۴۴﴾ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جنہوں نے حقوق اور ذمہ داریوں میں انسانوں کے درمیان مساوات قائم کردی۔ یہ اصول عصبیت کے خلاف انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور عدالت وفضیلت کے بنیادی قواعد کے احترام کی طرف دعوت دیتے ہیں، تاکہ پوری انسانیت ایسی پاکیزہ زندگی گزارے جو فی الواقع انسان کے شایانِ شان ہو، وہ انسان جسے اللہ نے شرف و بزرگی سے سرفراز کرکے اپنی زمین پر اپنا خلیفہ اور جانشین بنایا ہے۔ اسلام نے جہاں ایک طرف انسانوں کے درمیان وحدت و مساوات کا اصول طے کرکے اس کے ذریعے گروہی اور قبائلی جھگڑوں کی بیخ کنی کی، وہاں دوسری طرف اس نے توحید کا اصول مقرر کیا۔ اس اصول نے انسان کو اللہ کی حکمرانی کے علاوہ ہر ایک کی حکمرانی سے آزاد کر دیا ہے، اس تصور نے انسان کو اپنی عزت وتکریم کا احساس دلایا ہے۔ اب اس کی حیثیت اس آلے کی نہیں رہی جسے اللہ کے باغی اور سرکش استعمال کرسکیں۔ انسان اب اپنی آزاد شخصیت کا مالک ہے اور وہ اپنے حقوق کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنے سے پہلے اپنی ذمہ داریوں کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے۔ اسی بناء پر ہر فرد کا اسلامی معاشرے میں ایک خاص مقام اور نصب العین ہے۔ وہ اس معاشرے کی تعمیر میں بنیادی پتھر ہے۔ ماہرینِ قانون نے ۱۹۵۰ء میں جب حقوقِ انسانی کا عالمی اعلامیہ مرتب کیا تو انھوں نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ فرد ہی ملک و ریاست کا ستون ہے، جب کہ اسلام تقریباً تیرہ سو سال پہلے اس تصور کا اعلان کرکے ان سے سبقت لے چکا تھا۔(۳۹)

(۳۸) الحجرات:۱۳

(۳۹) الاسلام والعلاقات الدولیۃ، مصطفی حفناوی (مجلۃ المسلمون، ج ۳، شمارہ ۳، ص ۲۶۸)

اسلام اپنی تعلیمات کے اعتبار سے صرف انھی شاندار اصولوں پر محیط نہیں، اور نہ صرف عبادات ہی کا مذہب ہے، بلکہ وہ ایسے قواعد و اصول بھی وضع کرتا ہے جو ہمہ قسم کی انسانی سرگرمیوں کو منظّم کرکے، حقوق انسانی کا تحفظ اور فساد کا قلع قمع کرتے ہیں۔ یہ اصول و قواعد چوں کہ تمام انسانوں کے لیے ہیں، اس لیے ان کی مخاطب انسانی فطرت ہے، اسلام نے عقل انسانی کو اعلیٰ وارفع مقام دیا ہے۔ چناں چہ اس کے تمام اصول اس عالمی و آفاقی دین کی تعلیمات ہیں جو ہر دور اور ہر خطے کے لیے قابل عمل ہیں۔(۴۰)

## اسلام کی آفاقیت

﴿۳۴۵﴾ چوں کہ دورِ اوّل کے مسلمانوں کا اسلام کے عالمی دین ہونے پر ایمانِ صادق تھا اور تمام لوگوں تک پیغامِ اسلام پہنچانے کے حوالے سے اُنہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا، اس لیے وہ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر زمین میں پھیل گئے۔ اللہ کے سوا انھیں کسی کا کوئی خوف نہ تھا اور نہ وہ کسی کو ایمان لانے پر مجبور ہی کرتے تھے، کیوں کہ دین میں جبر ہے ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمانوں کے ہاتھوں بہت سے ممالک فتح ہوئے۔ انتہائی مختصر مدت میں اسلام دنیا کے دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔(۴۱) ان عظیم فتوحات اور تیزی سے ہونے والی اشاعتِ اسلام کے نتیجے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مختلف مشکلات اور مسائل نے جنم لیا۔ یہ مسائل اور مشکلات، زمان و مکان کے اختلاف کی وجہ سے مختلف نوعیت کی رہیں، لیکن ان سے نمٹنے کے اصول جو اسلام نے مقرر کیے ہیں، باہم مختلف اور متعارض نہیں۔

امام محمد بن حسن شیبانی وہ واحد اسلامی فقیہ اور ماہر قانون ہی، جنہوں نے پوری شرح و بسط کے ساتھ حالتِ صلح و جنگ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں تحریری خدمات انجام دیں۔ آپ کی کتابوں میں السیر الکبیر اور السیر الصغیر نمایاں کاوشیں ہیں۔

آئندہ صفحات میں حالتِ صلح و جنگ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے

---

(۴۰) العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، أبوزہرہ، ص ۱۹

(۴۱) دیکھیے: اقتباس ۱۳

اصول پر گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد حالتِ جنگ میں انھیں تعلقات کے اصول زیر بحث لاؤں گا۔ یہ ساری بحث اس موضوع پر امام محمدؒ کے تحریر کردہ اصولوں کی روشنی میں ہوگی۔

## ریاستوں کی اقسام

﴿۳۴۶﴾ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علاقوں اور ریاستوں کی اُن تین اقسام کا ذکر کر دیا جائے جن پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ فقہاء کے ہاں ریاستوں کی درج ذیل تین اقسام ہیں:(۴۲)

(الف) دار الاسلام، (ب) دارالعہد، (ج) دارالحرب

یہ تقسیم حکمِ واقعہ کے اعتبار سے ہے نہ کہ حکم شرعی کے اعتبار سے، کیوں کہ اسلام نے اسلامی ریاست کو جغرافیائی حدود سے مقید نہیں کیا۔(۴۳) اسلام ایک عالمی دعوت ہے، تاہم اس کے احکام کی تنفیذ مسلمانوں کے حکمران سے وابستہ ہے۔ دارالاسلام میں جوں جوں وسعت آئے گی، احکامِ دین کی تنفیذ اسی طرح وسعت اختیار کرتی جائے گی۔ اس لحاظ سے حالات کا تقاضا ہے کہ اسلام علاقائی حدود تک محدود ہو، تاآں کہ پوری دنیا مکمل طور پر دارالاسلام بن جائے۔(۴۴)

اس تقسیم میں اس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد جنگ ہے، اور نہ اس بات ہی کی کوئی دلیل ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، جیسا کہ بہت سے مستشرقین اور ان کے پیرو کاروں کا دعویٰ ہے۔ حالتِ جنگ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات پر غور و فکر کرنے، نیز اسلام میں جنگ کی غرض و غایت اور اس کے جائز اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے جو چیز ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ دینِ اسلام ایمان میں جبر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، نیز مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے قیام کی

---

(۴۲) نظریۃ الحرب فی الاسلام، محمد ابوزہرہ، ص ۳۔ بعض فقہاء اس میں چوتھے دار، یعنی دارالبغی کا اضافہ کرتے ہیں، یعنی جہاں باغیوں کی حکومت قائم ہو۔ زیلعی کے مطابق یہ وہ لوگ ہیں جو جائز حکمران کے خلاف ناحق خروج کریں (دیکھیے: تبیین الحقائق، ج ۳: ۲۹۳)

(۴۳) الاسلام و العلاقات الدولیۃ، مصطفیٰ حفناوی

(۴۴) الفقہ الجنائی المقارن، مستشار احمد موافی، ص ۹۰

بنیاد حالتِ صلح ہے، نہ کہ حالت جنگ۔

﴿۳۴۷﴾ فقہاء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ دار (ریاست) جہاں مسلمانوں کا اقتدار ہو، مسلمان اس کے محافظ ہوں اور اس دار کے محافظ اور دفاع کرنے والے موجود ہوں، تو وہ دارالاسلام (اسلامی راست) کہلاتا ہے۔ دارالعہد غیر مسلموں کی وہ ریاست ہے، جس کے کسی عہد و پیمان کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات قائم ہوں۔(۴۵)

دارالحرب کی تعریف کے بارے میں فقہاء کی دو مختلف آراء ہیں:

**اوّل:** دارالحرب وہ ریاست ہے جہاں مسلمان حکمران کا اقتدار نہ ہو اور نہ وہاں اسلامی احکام ہی نافذ ہوں، نیز مسلمانوں اور اس کے باشندوں کے درمیان کوئی معاہدہ بھی نہ ہو۔ یہ رائے امام محمد، امام ابو یوسف اور جمہور فقہاء کی ہے۔

**دوم:** کسی ریاست میں غیر مسلموں کے اقتدار کا قائم ہونا اسے دارالحرب نہیں بنا دیتا، بلکہ کسی ریاست کو دارالحرب قرار دینے کے لیے اس میں بیک وقت درج ذیل تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

☆ غیر اسلامی احکام نافذ ہوں۔

☆ یہ ریاست، اسلامی ریاستوں کے اتنی قریب ہو کہ اس سے اسلامی ریاست پر حملے کا اندیشہ ہو۔(۴۶)

☆ وہاں کوئی مسلمان اور ذمی اسلامی حکم کے مطابق پناہ نہ لے سکتا ہو، بلکہ خود کوئی معاہدہ کرکے اپنے طور پر امان لے سکتا ہو۔

یہ رائے اامام ابوحنیفہ، زیدیہ اور جمہور فقہاء کی ہے۔

---

(۴۵) نظریۃ الحرب فی الاسلام، صح ۳۰۔ العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص۵۳

(۴۶) اتنے فاصلے کی شرط کہ جس سے حملے اور زیادتی کا اندیشہ ہو، ہمارے اس دور میں غیر ضروری ہے۔ اب تو اسلحہ اتنی ترقی کرچکا ہے کہ جنگ کے لیے فاصلے کی کوئی اہمیت نہیں رہی (ایضاً)۔ تفسیر المنار میں ہے کہ دارالحرب غیر مسلموں کے علاقے کو کہتے ہیں، خواہ وہ برسرِ جنگ نہ ہوا۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کا ہم سے صلح کا معاہدہ نہ ہو وہ محارب ہے۔ (تفسیر المنار، ج ۶:۴۰۹)

☆ جس نے قبل از وقت کسی شی کے حصول کی کوشش کی اسے اس سے محرومی کی سزا دی جائے گی ☆

علامہ علاء الدین الکاسانی کہتے ہیں کہ: ''ہمارے اصحاب (احناف) کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دارالکفر (وہ ریاست جہاں نظم حکومت کفار کے ہاتھوں میں ہو) میں احکامِ اسلام کا اجراء ہو جائے تو وہ دارالاسلام (اسلامی ریاست) میں تبدیل ہوجاتا ہے''۔ دارالاسلام کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کس بناء پر دارالکفر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ان تین شرائط کے بغیر دارالاسلام، دارالکفر میں تبدیل نہیں ہوسکتا: (۱)اس میں کافرانہ احکام نافذ ہوں، (۲) دارالاسلام کے قریب ہو، (۳) وہاں کوئی مسلمان اور ذمی پہلی امان، یعنی مسلمانوں کی امان کے ساتھ باقی نہ رہے۔

امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دارالاسلام میں کافرانہ احکام نافذ ہونے سے وہ دارالکفر بن جاتا ہے۔(۴۷)

بعض معاصرین ۴۷ کی رائے ہے(۴۸) کہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے صاحبین اور جمہور فقہاء کی رائے کے مقابلے میں زیادہ راجح ہے، کیوں کہ امام موصوف نے دارالاسلام کے حکم کو اس بات کے ساتھ متعلق کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی امان کے زائل ہونے سے دارالحرب بن گیا ہے، نیز اس بناء پر کہ وہاں کے مسلمانوں پر زیادتی کا اندیشہ ہے۔ یہ نقطۂ نظر اسلامی جنگوں کے بنیادی تصور کے موافق ہے اور تصور یہ ہے کہ جنگ کے ذریعے ظلم و زیادتی کا ازالہ کیا جائے، کمزوروں کا تحفظ کیا جائے اور امن وسلامتی کوفروغ دیا جائے۔

﴿۳۴۸﴾ میں ابھی اس بات کی طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی اصل بنیاد حالتِ صلح ہی ہے، اور جنگیں بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں۔ اسلام کی عالمگیریت اور آفاقیت، جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے، تمام انسانوں کے درمیان مساوات، تعاون، باہمی الفت و محبت، عدالت اور تحفظِ فضیلت جیسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، اور ان بنیادی اصولوں کا لازمی تقاضا ہے کہ انسانی تعلقات پر باہمی محبت، باہمی کفالت اور باہمی اخوت کی چھاپ ہو۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جنگ، اگر جائز ہے تو صرف امت کو ان لوگوں سے تحفظ

(۴۷) بدائع الصنائع، ج ۷: ۱۳۰

(۴۸) العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص ۵۴

فراہم کرنے کے لیے جائز ہے جو زمین میں دنگا فساد کرتے ہیں اور اصلاح کے دشمن ہیں۔

حالتِ صلح میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات، اگر چہ عام اصولِ کلیہ میں باہم متحد ہیں، تاہم جزئیات میں مختلف ہیں۔ یہ اختلاف غیر مسلموں اور مسلمانوں کے حالات کے اختلاف کے پیشِ نظر ہے۔ غیر مسلم اہل ذمہ ہوں گے یا مستامنین، یا وہ جن کا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ ہوگا، یا وہ جن کا مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

اہلِ ذمہ ہمیشہ سے اسلامی ریاست کی رعایا اور اسلامی معاشرے کا ایک حصہ رہے ہیں۔ وہ ان تمام حقوق سے متمتع ہوتے رہے ہیں جن سے مسلمان متمتع ہوتے رہے ہیں، یعنی تحفظ و حمایت، انصاف، محبت و مودّت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی آزادی کی ضمانت،(۴۹) یہ سارے حقوق انھیں معمولی مالی ٹیکس کے بدلے میں حاصل تھے جو جزیہ کے نام سے معروف ہے۔ یہ جزیہ عورتوں اور بچوں کے بجائے کمانے پر قادر مردوں پر لازم ہوتا ہے، لہٰذا اہل ذمہ بین الاقوامی معاملات کے خاص اور عام مفہوم کے لحاظ سے اس کے دائرے سے خارج ہیں۔

## مستامنین

﴿۳۴۹﴾ مُستأمنین (مُستأمن کی جمع) سے مراد وہ لوگ ہیں جو مستقل قیام نہ کرنے کی نیت سے اسلامی ریاست میں داخل ہوتے ہیں، اور اس وجہ سے انھیں ایک متعین مدت کے لیے وہاں رہائش کی اجازت دی جاتی ہے، جس کی تجدید بھی ہوسکتی ہے۔ قاعدہ یہی ہے کہ وہ مستقل طور پر قیام پزیر نہ ہوں گے، ورنہ وہ (مستقل قیام کی صورت میں) مستأمن سے ذمی بن جائیں گے۔ اور اسلامی ریاست کی رعایا شمار ہوں گے۔(۵۰)

اسلام عدل و انصاف اور حریت و امن کا دین ہے۔ اس نے اپنے ملک میں آنے والے مستأمنین سے ہمیشہ انسانی شرافت پر مبنی سلوک کیا، اور یہ ایسے قوانین ہیں جن سے قوانین وضعیہ مانوس نہیں۔ اسلامی شریعت نے ہمیشہ دارالاسلام میں عقدِ امان اور محدود اقامت کی اجازت کی شرائط کی پابندی کی ہے۔ دارالاسلام نے اسے نقل وحرکت اور اپنے اس مقصد۔ مثلاً

(۴۹) اسلام میں ذمیوں کے حقوق کے لیے دیکھیے: کتاب الخراج، امام ابو یوسف، ص۴۳ وبعد، ارشاد الامۃ الی احکام الحکم بین اھل الذمۃ، شیخ محمد نجیب المطیعی

(۵۰) العلاقات الددلیۃ فی الاسلام، ص ۶۸

تجارت، تعلیم یا سیاحت۔ کے لیے جس کی خاطر وہ دارالاسلام میں وارد ہوا ہے، براہ راست کام کرنے کی مکمل آزادی دی ہے، وہ اپنی جان اور اپنے مال کے حوالے سے امن میں ہے، خواہ اس کا تعلق مسلمانوں سے برسرِ جنگ ریاست ہی سے ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مُستأمن دارالاسلام میں آئے گا، اس کے لیے لازم نہیں ہے کہ اس کا تعلق کسی ایسی ریاست سے ہو جس کا مسلمانوں کے ساتھ کوئی عہد و پیمان ہو۔ وہ ایسی ریاست کا باشندہ بھی ہوسکتا ہے جس کا مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہو، یا وہ مسلمانوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہو۔ جب تک اسے ہمارے ملک میں داخلے کی اجازت ہے، تب تک وہ اپنی امان کے عرصے میں مسلمانوں کی حفاظت میں ہے اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کے تحفظ کو یقینی بنائیں، خواہ اس کی وجہ سے انھیں جنگ سے دو چار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ اگر مشرکین مسلمانوں سے کہیں کہ اس (مُستأمن) کو ہمارے حوالے کرو، ورنہ ہم تم سے جنگ کریں گے اور مسلمان ان کے مقابلے میں طاقت ور نہ ہوں، تب بھی مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ مستأمن کو ان کے حوالے کر دیں، کیوں کہ ایسا کرنے سے اس کی امان کے ساتھ بدعہدی ہوگی۔(۵۱)

جمہور فقہاء کا تو، اس سے بڑھ کر یہ بھی خیال ہے کہ مُستأمن کا وہ مال جو اس نے دارالاسلام میں رہ کر کمایا ہے، اسی کی ملکیت ہوگا، اس بات سے اس کی ملکیت زائل نہیں ہوگی کہ وہ دارالحرب کو لوٹ جائے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو۔(۵۲)

﴿۳۵۰﴾ اس کے ساتھ ساتھ مُستأمن اپنی مذہبی آزادی سے مکمل طور پر فیض یاب ہوگا، تاہم مالی معاملات سے متعلق احکام میں مستأمن احکامِ شریعت کی پیروی کرے گا، خواہ یہ معاملات اس کے اور کسی مسلمان کے مابین ہوں، یا اس کے اور کسی ذمی کے مابین، یا اپنے جیسے کسی مُستأمن کے ساتھ ہوں۔

حدود سے متعلق احکام کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ تمام قسم کی حدود اس پر نافذ ہوں گی۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ صرف حقوق العباد

(۵۱) شرح السیر الکبیر، ج ۳: ۳۰۰

(۵۲) العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص ۶۸: المغنی لابن قدامۃ، ج ۱: ۴۳۷

☆جلبِ مصلحت کی نسبت مفاسد کو دور کرنا زیادہ بہتر ہے☆

سے متعلق معاملات میں اس پر حد جاری ہوگی۔(۵۳) یہی رائے امام محمدؒ کی ہے۔(۵۴) اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس سے خوش اسلوبی کا معاملہ اس لیے کیا تھا کہ وہ ہماری مملکت میں آئے اور اسلام کے محاسن کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے اور متاثر ہو کر اسلام قبول کرے۔ امان حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اُسے حقوق العباد بھی حاصل ہوں گے، کیوں کہ وہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے دارالاسلام میں داخل ہوا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ دارالاسلام کے باشندوں سے انصاف کا معاملہ کرے جس طرح اس سے انصاف کا معاملہ کیا جاتا ہے، اور جس طرح اسے اذیت اور نقصان نہیں پہنچایا جاتا، وہ بھی کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔

جہاں تک حقوق اللہ کا تعلق ہے، وہ اس پر لازم نہ ہوں گے، کیوں کہ وہ اس پر لاگو نہیں ہوتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس پر جزیہ عائد نہیں کیا جاتا اور نہ اسے دارالحرب واپس جانے سے ہی اسے روکا جاتا ہے۔(۵۵)

جمہور فقہاء کی اختیار کردہ رائے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان عدمِ تفریق پر مبنی ہے۔ ان کی یہ رائے ہے کہ مُستأمن تمام حدود میں احکامِ شریعت کا پابند ہوگا۔ یہ رائے اسلامی اصولوں کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے، کیوں کہ جن چیزوں پر ریاست کے امور کا انحصار ہے، ان کے ساتھ وہ متفق ہے، مثلاً فساد اور بگاڑ کی روک تھام اور اس کی حدود میں رہنے والے ہر شخص پر اس کے قانون کا مکمل نفاذ۔(۵۶)

## معاہدۂ صلح کرنے والی ریاست

﴿۳۵۱﴾ امام محمد دار العہد یا موادعہ پر گفتگو کرنے والے پہلے فقیہ شمار ہوتے ہیں۔(۵۷) امام موصوف کے پیش رو فقہاء اور قانون بین الممالک کے موضوع پر لکھنے والے صرف دارالاسلام اور دارالحرب کے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ معاہدات یا تو مسلمانوں اور ان کے تابع اہل ذمہ کے درمیان طے پاتے تھے، یا مسلمانوں اور مُستأمنین کے درمیان جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ

(۵۳) شرح السیر الکبیر، ج ۴: ۱۰۸
(۵۴) الاصل، ورق ۹۵: المبسوط، ج ۹: ۵۵
(۵۵) تبیین الحقائق، ج ۳: ۱۸۲
(۵۶) العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص ۷۱
(۵۷) شرح السیر الصغیر، المبسوط، ج ۱۰: ۸۵،۴:۱

ہوتے تھے، لیکن امام محمد(۵۸) نے ایک ایسے دار (ریاست) پر گفتگو کی ہے جو مسلمانوں کے اقتدار کے ماتحت نہ ہو، کیوں کہ اس صورت میں اس کے باشندے اہلِ ذمہ شمار نہیں ہوں گے۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ باہمی صلح و امن کا معاہدہ کرلیا تو اس لحاظ سے وہ برسرِ جنگ علاقے سے بھی خارج ہوگئے۔

امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ معاہدۂ صلح صرف اس صورت میں جائز ہے جب مسلمانوں کی حالت کمزور ہو۔ اگر وہ طاقت ور ہوں تو پھر یہ جائز نہیں ہے۔ امام موصوف نے باہمی معاہدۂ صلح کی بنیاد صلحِ حدیبیہ کو قرار دیا ہے۔(۵۹) کیوں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان ایک مقررہ مدت کے لیے عارضی معاہدۂ صلح تھا۔

﴿۳۵۲﴾ حالات خواہ کیسے ہوں، اگر وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے معاہدۂ صلح پر مجبور کردیں تو مسلمانوں اور معاہدۂ صلح کرنے والے علاقے کے باشندوں کے درمیان تعلقات انتہائی احترام کی بنیاد پر قائم ہوں گے، خواہ صلح کے یہ معاہدے تحریری ہوں یا غیر تحریری، کسی بھی صورت میں بدعہدی اور خیانت جائز نہ ہوگی۔ ہر معاملے میں باہمی تعاون ہوگا، سوائے ایسے معاملے کے جو غیر مسلموں کی تقویت کا باعث ہو، مثلاً اسلحے کے لین دین وغیرہ میں تعاون کرنا۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ غیر مسلم معاہدین یا برسرِ جنگ غیر مسلموں کو کسی ایسی چیز کے حصول کا موقع فراہم نہ کریں جو ان کی قوت اور جنگی طاقت میں اضافے کا باعث ہو۔(۶۰)

امام محمدؒ انتہائی باریک بینی اور گہرائی میں جا کر معاہدین کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی پاسداری کرنے اور بدعہدی سے پرہیز کرنے کے حوالے سے مسلمانوں پر عائد ذمہ داریوں کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے ایک حصے کو اختصار کے ساتھ بیان کرنا مفید ہوگا، کیوں کہ اس سے غیر مسلموں کے معاملے میں اسلامی نظریہ کی بلند نگاہی، نیز اس انسانی اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے، جس میں امام محمدؒ قانون بین الممالک کے ماہرین سے سبقت لے گئے، حتیٰ کہ دورِ حاضر کے ماہرین قانون سے بھی۔

---

(۵۸) العلاقات الدولیۃ، ص ۵۶

(۵۹) شرح السیر الکبیر، ج ۴: ۶۱

(۶۰) شرح السیر الکبیر، ج ۳: ۵۸، ۱۷۷، ۲۷۶

☆ عام کی تخصیص نیت کے ساتھ دیانۃً مقبول ہوتی ہے نہ کہ قضاءً ☆

﴿۳۵۳﴾ امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر معاہدۂ صلح کرنے والے معاہدے کے آغاز میں یہ شرط لگا دیں کہ اگر ان سے بدعہدی کی گئی اور اس کے نتیجے میں انھوں نے مسلمانوں کے قیدی قتل کر دیے تو ان کے قیدیوں کا خون ہمارے لیے حلال ہوگا، پھر انھوں نے ہمارے (مسلمانوں کے) قیدی قتل کر دیے، تب بھی ان کے قیدی کا خون ہمارے لیے حلال نہ ہوگا۔(۶۱)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به (اور اگر تم بدلہ لو تو بس اس قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو)(۶۲) کی روشنی میں معاہدین کے قیدیوں کو قتل کرنا مباح ہے، جب کہ انھوں نے ہمارے قیدیوں کو قتل کر دیا ہو، مگر امام محمدؒ نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ معاہدین کے قیدی دارالاسلام میں داخل ہونے کی بناء پر پناہ میں آ گئے، انھیں بھی تحفظِ جان کے ضمن میں مسلمانوں جیسی حرمت حاصل ہے، سوائے اس کے کہ انھیں قتل کرنا برحق ہو، انھوں نے بذاتِ خود ہمارے کسی قیدی کو قتل نہیں کیا۔

مسلمان حکمران پر لازم ہے کہ مظلوموں کو ان لوگوں سے انصاف دلائیں، جنہوں نے ان پر زیادتی کی ہے۔ جس طرح اس صورت میں قیدیو کو قتل کرنا جائز نہیں، اسی طرح تمام حالات میں سفیروں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح کسی حال میں بھی سفیروں سے بدسلوکی کرنا ناجائز ہے، کیوں کہ وہ مسلمانوں کی پناہ میں ہوتے ہیں، تا آں کہ اپنے ملک میں واپس چلے جائیں۔ اگر چہ اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ سفراء سزاؤں کے معاملے میں کس حد تک احکامِ اسلام کے تابع ہوں گے، تاہم اس بات پر فقہاء متفق ہیں کہ وہ معاملات کے سلسلے میں احکامِ اسلام کے پابند ہوں گے۔(۶۳)

جب تک مسلمان طاقت ور نہ ہو جائیں، ضعف کی حالت میں معاہدۂ صلح جائز ہے۔ پھر اگر وہ محسوس کریں کہ اب وہ طاقت ور ہیں، اور وہ معاہدہ توڑنا چاہیں تو یہ نقضِ عہد ان کے اور معاہدین کے درمیان کیسے مکمل ہوگا، جب کہ یہ ایسا نقضِ عہد ہے کہ جس کا مقصد بنیادی طور پر جنگ کی خواہش نہیں ہے اور نہ مادی وسائل کے حصول کی کوشش ہے، بلکہ اس کی غرض اس پیغام

(۶۱) شرح السیر الکبیر، ج۴:۴۳

(۶۲) سورۃ النحل:۱۲۶

(۶۳) العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص۴۷

مقدس کی ادائیگی ہے جسے اللہ نے ان پر لازم کر دیا ہے۔

امام محمدؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں: ''حاکمِ وقت معاہدہ کرنے کے بعد اگر مناسب سمجھے کہ جنگ کرنے میں ہی خیر اور بہتری ہے، تو وہ معاہد ملک کی طرف سفیر بھیج کر معاہدہ توڑنے کی اطلاع دے دے تو اس طرح معاہدہ ختم ہو جائے گا۔'' مزید فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ ان معاہدین اور ان کی مملکت پر حملہ کریں، جب تک اتنا وقت نہ گزر جائے جتنا سفیر کو وہاں تک پہنچ کر انھیں خبردار کرنے میں لگتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان کی حکومت نقضِ عہد کی یہ اطلاع اپنی اطرافِ مملکت تک کچھ وقت صرف کر کے ہی پہنچا سکتی ہے، لہٰذا ان کے حق میں معاہدہ توڑنے کی تکمیل اس وقت تک نہ ہوگی، جب تک اتنا وقت گزر نہ جائے، جس میں وہ اپنی پوری مملکت میں اس کی اطلاع پہنچا دیں۔

یہ مدت گزر جانے کے بعد ان پر حملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، خواہ مسلمانوں کو اس بات کا علم نہ ہو کہ معاہدہ توڑنے کی اطلاع اُنہیں پہنچ چکی ہے، کیوں کہ ان کی پوری مملکت کو اس کی اطلاع دینا لازم نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کو یقین ہو کہ معاہدین کو نقضِ عہد کی اطلاع نہیں پہنچی تو ان کے لیے مستحب یہی ہے کہ ان پر حملہ نہ کریں تا آں کہ انھیں اطلاع ہو جائے، کیوں کہ اولین صورت دھوکا دہی کے مشابہ ہے، مسلمانوں پر جس طرح دھوکا دہی سے اجتناب لازم ہے، اسی طرح اس چیز سے بھی اجتناب لازم ہے جو دھوکا دہی کے مشابہ ہو۔(۶۴)

کیا انسانوں کے خود ساختہ قوانین بین الممالک مندرجہ بالا بلند مرتبہ اور شان و شوکت کے حامل قواعد و ضوابط سے واقف ہیں؟ کیا دورِ حاضر کا مہذب انسان اپنی تباہ کن جنگوں میں اس کے عشرِ عشیر کا بھی لحاظ کرتا ہے؟ یا وہ کمزوروں اور بے گناہوں کو ہلاکت کے گھاٹ اُتار کر اور معاہدین پر مکر و فریب کے ذریعے اچانک حملہ کر کے فخر و ناز کرتا ہے؟

اگر نقضِ عہد دشمنوں کی جانب سے ہو تو مسلمانوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان کی مملکت پر حملہ کر دیں، چاہے انھیں اس بات کا یقین ہو کہ ان تک معاہدہ توڑنے کی اطلاع نہیں پہنچی، امام محمدؒ یہ کہتے ہوئے اپنی غلطی کی تلافی کرتے ہیں: ''اگر مسلمانوں کی جانب رہنے والے دشمن کے

---

(۶۴) شرح السیر الکبیر، ج ۴: ۷

باشندوں تک اطلاع پہنچ جائے، مگر دشمن کے اصل علاقے تک یہ خبر نہ پہنچے تو ان سے جنگ کرنا مناسب نہیں ہے، تاآں کہ انھیں معاہدہ توڑنے کی اطلاع دے دیں۔ یہ حکم بر سبیل استحسان ہے''۔(۶۵)

یہ اس خالص انسانی اندازِ فکر کی انتہائی بلندی ہے، جس کے سوتے ایمانِ صحیح، خُلقِ کامل، ورعِ صادق، زندہ ضمیر، سراپا رحم عدل و انصاف اورمعزز انسانی اخوت سے پھوٹتے ہیں۔ آج انسانیت اس کی کتنی محتاج ہے! علمی اور تہذیبی میدان میں خاطر خواہ ترقی اور نت نئی ایجادات کے باوجود پریشان حال، جبر واستبداد کا شکار، سسکتی اور دم توڑتی امن وسکون سے عاری انسانیت، اسلام کی عطا کردہ بلند فکری اور وسیع نظری کی سخت محتاج وضرورت مند ہے، جو اسے اس کی حقیقی انسانیت، امن اور استقرار لوٹا دے۔

﴿۳۵۴﴾ وہ غیر معاہدین جو مسلمانوں کے ساتھ نہ عملاً برسر جنگ ہوں اور نہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق اور معاہدہ ہی ہو، وہ جب تک مسلمانوں کے لیے اذیت و پریشانی کا باعث نہ ہوں، اور نہ ان کے خلاف دوسروں کو برانگیختہ کرتے ہوں، ان کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق بعینہ انھی بنیادوں پر قائم ہوگا جن پر مسلمانوں کا تعلق صلح کرنے والوں کے ساتھ احسان، حسن سلوک اور ان کے ساتھ منافع کے تبادلے کی صورت میں قائم ہوتا ہے، سوائے کسی ایسے معاملے کے جس سے ان کی جنگی اور دفاعی قوت میں اضافہ ہو۔ اگر ہم ان کے پاس دعوتِ اسلام کی تبلیغ کی غرض سے جانا چاہیں تو انھیں پیشگی اس کی اطلاع دینا، اور ان پر زیادتی نہ کرنا ضروری ہے۔ ان سے بدعہدی کرنا اور اچانک حملہ کرنا جائز نہیں۔(۶۶)

## اسلام میں جنگ کی حقیقت

﴿۳۵۵﴾ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان اسلحہ سے لیس کیوں ہوتے ہیں اور دوسروں سے جنگ کیوں کرتے ہیں؟

اسلام، اصلاً جب تمام انسانوں کے درمیان امن وسلامتی، محبت ومودّت اور بھائی

(۶۵) شرح السیر الکبیر، ج۴: ص۸

(۶۶) شرح السیر الکبیر، ج ۳:۱۰۹، ۴:۱۶، ۲۳

چارہ قائم کرنے کا علمبردار ہے، خواہ کوئی اس پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، تو پھر اس نے جنگ کو مباح کیوں قرار دیا ہے، جہاد کی ترغیب کیوں دیتا ہے؟ راہِ خدا میں شہید ہونے والوں کو اجرِ عظیم اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں بھری جنت کی خوش خبری کیوں دیتا ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ، اسلام کے اصولوں میں سے کوئی اصول نہیں ہے، بلکہ وہ ایمان لانے کے سلسلے میں ہر قسم کے جبر اور سختی کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، کیوں کہ صحیح عقیدے کی اساس وجدان و برہان پر مبنی کامل اطمینان ہے۔ وہ کسی ایسی قوت کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، جو انسان کو کوئی ایسا عقیدہ اپنانے پر مجبور کرے جس سے اس کا دل انکار کرتا ہو، اور اس کی عقل متنفر ہو۔ اس پس منظر میں اسلامی جنگوں کی غرض و غایت کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے۔ جیسا کہ میں کئی بار اشارہ کر چکا ہوں۔ کہ اسلام ایک عالمی اور آفاقی دین ہے۔ یہ پوری انسانیت کی صلاح و فلاح کے لیے آیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دین عربوں تک پہنچایا، اور اپنی قوم کو روشن شاہراہ پر گامزن کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اور ان عربوں پر، جنھیں اللہ نے اپنے آخری رسول کی امت کے لیے منتخب کیا تھا، یہ ذمہ داری عائد کر گئے کہ وہ اس دین کو دوسری اقوام تک پہنچائیں، کیوں کہ شرعی احکام انھی پر لازم ہوتے ہیں جن تک یہ احکام پہنچ چکے ہوں، جیسا کہ امام محمدؒ کا قول ہے،(۶۷) لہٰذا غیر عربوں کو جب تک دعوتِ اسلام نہ پہنچے، ان کے خلاف حجت قائم نہیں ہوسکتی، بلکہ حجت تو صرف انھی لوگوں کے خلاف قائم ہوسکتی ہے جن تک دعوتِ دینِ اسلام پہنچی، اور انھوں نے آگے دوسری قوموں تک پہنچانے میں کوتاہی کی۔

﴿۳۵۶﴾ ہر زمانے اور ہر مقام کے لوگوں تک دینِ اسلام کی دعوت پہنچانے اور اس کی دعوت کے تحفظ کی غرض سے جہاد فرض قرار دیا گیا ہے، جو قیامت تک جاری رہے گا، یہ جہاد فقط تبلیغ دین کے تحفظ کی خاطر فرض ہے۔ اس کے بعد جو چاہے ایمان قبول کرے اور جو چاہے کفر کا رویہ اختیار کرے۔ تاریخ کے واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ اللہ کے باغی اور سرکش، عامۃ الناس کو اپنی آزاد مرضی سے کوئی دین قبول کرنے، یا اس کی دعوت سننے کی اجازت نہیں

(۶۷) شرح السیر الکبیر، ج۴: ص۲۹۱

دیتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اللہ وحدہٗ کی بندگی کی دعوت دی اور بت پرستی چھوڑنے کی تلقین کی تو انھوں نے آپ پر اذیتوں اور ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ آپ کی تصدیق اور اتباع کرنے والوں کو سزائیں دیں اور بالآخر آپ کو اور آپ کے رفقاء کو مکے سے نکال دیا۔

مشرکین مکہ نے دلوں اور عقلوں پر پہرے بٹھانے کی کوشش کی اور لوگوں کو فکر اور انتخاب کی آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح کفار دینِ حق سے روکنے کے لیے جبر کے اصول کی حمایت کر رہے تھے۔ اگر کفار کو ان کی اسی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو باطل حق پر چڑھ دوڑتا اور کفر و شرک کی تاریکیاں نورِ حق کو مٹا دیتیں،(۶۸) لہٰذا جنگ کا حکم دیا گیا اور قوت فراہم کرنے کی ترغیب دی گئی، تاکہ اس ظلم کا خاتمہ ہو جسے مسلمان برداشت کر رہے تھے اور یہ ظلم محض اس بناء پر ان پر روا رکھا جا رہا تھا کہ انھوں نے علی الاعلان کہا تھا کہ اُن کا رب اللہ ہے: **اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا وان اللّٰه علی نصر هم لقدیرo الذین اخرجوا من دیارهم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللّٰه، ولو لا دفع اللّٰه الناس بعضم ببعض لهدمت صوامع و بیع وصلوات و مساجد یذکر فیها اسم اللّٰه کثیراo** (اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقا ہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں)(۶۹)

چناں چہ اسلام میں جنگ کی اصل غرض وغایت انسانوں کو سرکش اور گمراہ رہنماؤں سے آزادی دلانا ہے تاکہ زمین پر اللہ کی حکمرانی کے سوا کسی کی حکمرانی باقی نہ رہے، اور فتنہ وفساد کا قلع قمع ہو جائے اور دین اپنی مکمل شکل میں صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔

﴿۳۵۷﴾ چوں کہ اسلامی جنگ کی اصل غرض و غایت مذہبی آزادی کو یقینی بنانا ہے،

(۶۸) نظم الحرب فی الاسلام، جمال الدین عباد، ص ۲۱
(۶۹) سورۃ الحج: ۳۹-۴۰

لہٰذا اسلام نے جنگ کی گرمی کو کم دیا، اور اس کے لیے ایک عادلانہ قانون اور محکم نظام مقرر کیا ہے۔ جس چیز کو، اسلام نے جنگی معاملے میں سب سے بڑھ کر لازم قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ مالِ غنیمت کے حصول، ٹیکس اور جرمانے عائد کرنے کی غرض سے جنگ نا جائز ہے، اس نے کلمۃ اللہ کو قوموں کے درمیان فروغ دینے کے لیے بوقت ضرورت جنگ کو بطور وسیلہ جائز قرار دیا ہے۔(۷۰)

جب مسلمان غیر مسلموں کی طرف روانہ ہوں تو ان کی اوّلین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ جنگ کرنے، یا ان پر زیادتی کرنے میں پہل نہ کریں۔ ایسا اس لیے ہے کہ بنیادی طور پر جنگ کا خواہش مند ہونے کی ان کے ہاں گنجائش نہیں ہے، کیوں کہ وہ اصحابِ دعوت ہیں۔ ان کی ذمہ داری محض ابلاغِ حق ہے۔ اس لحاظ سے جنگ سے پہلے دو امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر اتفاق ہو جائے تو پھر جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے:

اوّل: سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی جائے۔ شرح السیر الصغیر(۷۱) میں مذکور ہے۔

''دعوتِ اسلام کی مخاطب کبھی ایسی قوم ہوتی ہے جس تک دعوت کبھی نہ پہنچی ہو، اس صورت میں تو اسے اسلام کی دعوت سے خبردار کرنا لازم ہے، تاکہ اس کے افراد اپنے معاملے میں واضح دلیل پر قائم ہوں۔ کبھی دعوتِ اسلام کی مخاطب ایسی قوم ہوتی ہے جو پہلے سے دعوتِ اسلام سے آگاہ ہوتی ہے اور دوبارہ اسے دعوت دینا ایک امر مطلوب ہوتا ہے۔'' شرح السیر الصغیر میں ہے: ''یہ نفع مند چیز کے بارے میں خبردار اور آگاہ کرنے میں انتہائی کوشش اور مبالغہ ہے یہ اس بات کو لازم کرتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں جنگ پر صلح کو ترجیح دی جائے۔ یہ لوگ اپنی مرضی اور اختیار سے پیش کردہ دعوتِ اسلام کو قبول کرلیں تو وہ ہمارے بھائی ہیں، ان کے وہی حقوق ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں، اور جو ہماری ذمہ داریاں ہیں، وہی ان کی ذمہ داریاں ہوں گی۔ اگر وہ دعوت اسلام قبول کرنے سے انکار کردیں اور اسے قبول نہ کریں تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ انھیں دوسری چیز کی طرف دعوت دیں، یعنی وہ مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان کرلیں اور ذمی بن کر رہیں۔ ان کے عقائد میں ان سے کوئی تعرض نہیں کرے گا اور معمولی ٹیکس (جزیہ) کے

(۷۰) مھمۃ الدین الاسلام فی العالم، محمد فرید وجدی، مجلّہ نور الاسلام بابت ۱۳۵۲ء صفحہ ۳۷۱

(۷۱) المبسوط، ج ۱۰: ۶

بدلے میں وہ حفاظت و رعایت کے تمام حقوق سے فیض یاب ہوسکیں گے۔ یہ ٹیکس ان کے معذور افراد (بچوں، بوڑھوں، عورتوں، اپاہج افراد وغیرہ) پر لاگو نہیں ہوگا۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ مسلمان ان سے محفوظ اور مطمئن رہیں، تاکہ غیر مسلم مسلمانوں پر غلبہ حاصل نہ کریں۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ کسی عہد و پیمان میں شریک ہونے سے انکار کردیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے کھلم کھلا زیادتی کا مظاہرہ کیا ہے، اور گمراہی کی تمام حدود پھلانگ گئے ہیں۔ اس صورت میں ان سے جنگ کی جائے گی اور اس کا مقصد لوگوں کو ان کے جبر اور تسلط سے آزادی دلانا ہوگا۔

شرح السیر الصغیر (۷۲) میں مذکور ہے کہ کفر، اگرچہ عظیم ترین جرم ہے، مگر وہ بندے اور اس کے ربِ کریم کا معاملہ ہے اور اس قسم کے جرم کی سزا کو وہ آخرت تک مؤخر کر دیتا ہے، لیکن جو سزا جنگ کی شکل میں دنیا میں فوری طور پر دی جاسکتی ہے، وہ اس لیے جائز ہے کہ اس کی منفعت بندوں ہی کی طرف لوٹتی ہے۔

مذکورہ وضاحت کے نتیجے میں یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اسلام میں قتال (جنگ) کا مقصد دین میں جبر کرنا نہیں ہے، بلکہ بندوں کے مصالح و مفادات کو یقینی بنانا ہے، انھیں ظالم و جابر باغیانِ خدا سے نجات دلانا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت کا راستہ خاردار جھاڑیوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے صاف ہو جائے، پھر اس شاہراہ پر جو چلنا چاہے، وہ اسے اختیار کرلے، اور جو منکر ہو وہ اعتراض کرے۔

﴿۳۵۸﴾ قتال (جنگ) فتنۂ کفر اور شر کفار کے استیصال کے لیے ہمیشہ جاری رہے گا، قتال صرف انھی لوگوں سے جائز ہے جو فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں، اور عمل یا قول کے ذریعے شر پھیلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں، بچوں اور پاگلوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔(۷۳) خواہ وہ ہتھیار بھی اٹھائے ہوئے ہوں۔ اسی طرح جو لوگ الگ تھلگ رہ کر رہبانیت کی زندگی گزارتے ہیں اور راہب خانوں میں رہتے ہیں، انھیں، نیز قریب الموت بوڑھوں کو بھی قتل کرنا

(۷۲) المبسوط، ج ۳: ۱۹۷

(۷۳) المبسوط: ج ۳: ۱۹۷

جائز نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: **وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلو نکم** (اور تم ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں)، جب کہ یہ لوگ جنگ نہیں کرتے،(۷۴) البتہ اگر ان میں سے کوئی اپنی رائے یا عمل کے لحاظ سے شریکِ جنگ ہو، تو وہ مقاتل (برسر جنگ) شمار ہوگا، اور اس سے لڑنا اور اسے قتل کرنا جائز ہوگا، سوائے دیوانے اور مخبوط الحواس کے، تاہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ اسے پکڑ کر جنگ میں شریک ہونے سے باز رکھیں۔(۷۵)

اسی طرح ان کفار کو قتل کرنا ممنوع ہے جو جنگ نہ کر رہے ہوں۔ بدعہدی کرنا، لاشوں کا مثلہ کرنا، سروں کو کاٹ کر لے جانا، درختوں کو کاٹنا، گھروں کو ویران کرنا، لشکر کو کھلانے کی ضرورت کے بغیر مویشیوں کو ذبح کرنا ممنوع ہے۔(۷۶) اسی طرح دورانِ جنگ میں چوری کرنے، لوٹ مار کرنے اور مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کی ممانعت ہے۔

﴿۳۵۹﴾ جب جنگ ختم ہو جائے تو نہ کسی قیدی کو قتل کیا جائے، نہ کسی زخمی کو جان سے مارا جائے، نہ بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے، نہ دارالحرب کے کسی باشندے کو مشقت میں ڈالا جائے، بلکہ ان سب سے انسانیت کے حوالے سے سلوک کیا جائے، شرافتِ انسانی کی تذلیل و رسوائی کا سلوک نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی طرف سے رحم و کرم اور عدل و انصاف کا ہی مظاہرہ ہونا چاہیے۔

برسر جنگ ریاست کے باشندوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاہدہ طے پانے یا صلح ہونے سے پہلے ان سے انسانی بنیادوں پر معاملہ کیا جائے گا، مثلاً ان کے اور ہمارے درمیان تجارت جاری رہے گی، صرف مسلمانوں پر یہ لازم ہوگا کہ وہ دارالحرب میں کوئی ایسی چیز تجارت کی غرض سے نہ لے جائیں جو ان کے باشندوں کی قوت اور جنگی طاقت میں اضافے کا باعث ہو۔ شرح السیر الصغیر میں مذکور ہے: ''مسلمانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ایسے کاروبار سے احتراز کریں جو برسرِ جنگ ریاست کی قوت کا سبب ہو، تاکہ ہم کھانے پینے کی چیزوں اور کپڑوں کی تجارت میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً یہ روایت ہے کہ ثمامہ بن اثال حنفی نبی کریم صلی

(۷۴) شرح السیر الکبیر، ج ۳: ۱۸۱، ۱۹۱

(۷۵) ایضاً، ج ۳: ۱۹۴، ۱۹۷

(۷۶) شرح السیر الکبیر، ج ۱: ۴۴۔ تحقیق صلاح الدین المنجد

☆ الضرر لا یزال بالضرر ☆ نقصان کا ازالہ نقصان سے نہیں کیا جائے گا ☆

اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام لے آئے تو انھوں نے اہل مکہ کو غلے کی ترسیل بند کر دی۔ اہل مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تحریری درخواست کی کہ آپؐ انھیں غلہ بھیجنے کی اجازت عطا فرمائیں تو آپؐ نے اس کی اجازت دے دی، حالانکہ اہل مکہ ان دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے برسر جنگ تھے۔ پس معلوم ہوا کہ اس جیسی چیزوں کی برسرِ جنگ ریاست کو ترسیل میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۷۷)

﴿۳٦۰﴾ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جنگ نظریۂ ضرورت کے تحت، قانونِ عدل اور احترامِ انسانیت کے تابع ہوتی ہے۔ قوموں کو غلام بنانے اور ان کے مادی وسائل پر تسلط جمانے کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جنگ کا بنیادی مقصد لوگوں کے درمیان دائمی امن و سلامتی کا قیام ہے، کیوں کہ یہ مسلمانوں کو جنگی تاجروں اور ان سرکش گمراہ لیڈروں سے نجات دلاتی ہے جو مسلمانوں کو ایسے طرزِ عمل پر مجبور کرتے ہیں جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کی اصل بنیاد صلح و امن ہے۔ غیر مسلموں کے حوالے سے اسلام کا نظریہ ظلم و زیادتی، تعصب و تکبر اور بڑائی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ درگزر، تعاون، اخوت، معاہدوں کے احترام اور ان کی پاسداری پر مبنی ہے۔ حالات و اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، اللہ کا یہ ارشاد مبنی بر صداقت ہے: **لا ینھٰکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخر جو کم من دیار کم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللّٰہ یحب المقسطین انما ینھٰکم اللّٰہ عن الذین قٰتلو کم فی الدین و اخرجو کم من دیار کم و ظٰھروا علی اخراجکم ان تو لوھم ومن یتولھم فائولٰئک ھم الظالمون** (اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ نہ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں، وہی

(۷۷) شرح السیر الکبیر، ج۳: ۱۷۷۔۱۷۸

ظالم ہیں)(۷۸)

یہ دونوں آیات بین الممالک تعلقات کے بارے میں اسلامی دستور کا خلاصہ ہیں۔ یہ دستور صلح و آشتی کا علمبردار ہے اور مودّت و دوستی کو عداوت و دشمنی پر ترجیح دیتا ہے، تاکہ انسانی محبت اور چاہت کو فروغ حاصل ہو، اور انسانی تعلقات مضبوط ہوں، حتیٰ کہ ان کے ساتھ بھی دوستی و مودّت کا داعی ہے جو اس کے دشمن ہیں جب تک کہ وہ زیادتی کے مرتکب نہ ہوں، مذکورہ دو آیات سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان ہوا ہے: **عسی اللّٰہ ان یجعل بینکم و بین الذین عادیتھم منظم مودۃ و اللّٰہ قدیر واللّٰہ غفور رحیم**(۷۹) (بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے، جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور وہ غفور رحیم ہے)(۸۰)

## بین الممالک تعلقات کی اسلامی بنیادیں

﴿۳۶۱﴾ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اسلام میں بین الممالک تعلقات کی بنیاد مندرجہ ذیل امور ہیں:

اوّل: انسانی مساوات: تمام انسان ایک ہی امت ہیں، ان کے درمیان کوئی گروہی اور نسلی تقسیم نہیں۔ رنگ، نسل اور وطن ان کے درمیان فضیلت کا معیار نہیں، بلکہ فضیلت کا معیار اللہ کا خوف اور اس کے سامنے جواب دہی کا احساس ہے: **ان اکرمکم عند اللّٰہ أتقاکم** (تم میں سب سے زیادہ اللہ کے ہاں قابل احترام وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے)۔

دوم: انسانوں کے درمیان تعلق کی اصل بنیاد صلح ہے۔ مساوات اور وحدت کے اصول کی پختگی پر انسانوں کے درمیان تعلق کا قیام محبت و مودّت اور سلامتی و یک جہتی کی صورت میں منحصر ہے،

---

(۷۸) الممتحنہ: ۸۔۹ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدکورہ دونوں آیتوں کو سورۃ التوبہ کی اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ ''فاقتلو المشرکین حیث و جتموھم (اور مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو)۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں آیتیں رسول اللہ کے حلیفوں کے ساتھ خاص ہیں اور ان کے ساتھ خاص ہیں جنہوں نے عہد نہ توڑا ہو۔ اکثر اہلِ تاویل کہتے ہیں کہ ''یہی رائے محکم ہے، اور یہی صحیح ہے'' (دیکھیے۔ احکام القرآن للجصاص، ج ۳: ۴۳۹، تفسیر القرطبی، ج ۱۸: ۵۹، النسخ فی القرآن الکریم، مصطفیٰ زید، ص۵۵۳)

(۷۹) الممتحنہ: ۷ (۸۰) الحجرات: ۱۳

☆ ماحرم اخذہ حرم اعطاؤہ ☆ جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے۔☆

کیوں کہ غلبہ و استیلاء اور آزادی سلب کرنے کی خاطر برپا ہونے والی جنگوں کے تمام اسباب و وسائل کا جب تک خاتمہ نہ کر دیا جائے، مساوات کا مفہوم اپنی قدر و قیمت کھو دے گا۔(۸۱)

سوم : جنگ برائے قیامِ امن: اسلام اگر انسانوں کے درمیان تعلق کی اصل بنیاد امن و سلامتی کو قرار دیتا ہے تو یہ بات اس سے متعارض نہیں ہے کہ وہ جنگ کی اجازت دیتا ہے اور جہاد پر ابھارتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس جنگ کو وہ مباح قرار دیتا ہے، وہ بنیادی طور پر امن کے تحفظ اور روئے زمین پر اسے یقینی بنانے اور قائم کرنے کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کے ایسے قوانین وضع کیے ہیں جو سراسر رحمت اور خیر ہیں۔

چہارم : عدل و انصاف: اسلام ظلم کی تمام صورتوں کو حرام قرار دیتا ہے اور تمام حالات میں دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ عدل کا رویہ اپنانے کا حکم دیتا ہے۔ **ولایجر منکم شنأن قوم علی ألا تعدلوا اعدلوا ھو أقرب للتقوی** (کسی قوم کی مخالفت تمہیں ہرگز اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل سے پہلو تہی کرو، عدل سے کام لو کہ یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے)(۸۲)

اگر چہ یہ عدالت ہی کا تقاضا ہے کہ ہم زیادتی کا جواب اس جیسی زیادتی سے دیں : **فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ماعتدی علیکم و اتقوا اللّٰہ** (پس اگر تم بدلہ لینا ہی چاہو تو اسی قدر زیادتی کرو جس قدر تم پر کی گئی ہے اور اللہ سے ڈرو)،(۸۳) مگر اسلام، جیسا کہ آیت کریمہ وضاحت کر رہی ہے، مطلقاً زیادتی کا جواب اتنی ہی زیادتی سے دینے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اس کے ساتھ خوفِ الٰہی کی قید بھی لگاتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلام میں عدل کا تصور انسانیت اور رحمت پر مبنی ہے جو ظلم سے واقف نہیں ہے۔ اسلام نہ انسانی کرامت و فضیلت کی اہانت کرتا ہے، نہ اسے اجڈ پن اور وحشت کی سطح تک نیچے گراتا ہے، اگرچہ غیر مسلم اس پستی کی حد تک گر گئے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام دینِ قوت ہے۔ یہ قوتِ ایمان، قوتِ بدن اور فوجی قوت کا دین ہے تاکہ ہم ہمیشہ عدل و انصاف اور انسانی شرف و فضل کا تحفظ اور دفاع کر سکیں۔

مسلمانوں کا اپنے دشمنوں کے ساتھ دوران جنگ میں عدل و انصاف کا ایک بہترین

(۸۱) سورۃ المائدۃ:۸ (۸۲) سورۃ البقرۃ:۱۹۴

(۸۳) اسبوع الفقہ الاسلامی الثالث، ص ۲۰۰

یادگار واقعہ یہ ہے: جب مسلمان فاتح و قائد قتیبہ بن مسلم باہلی سمرقند میں اس کے باشندوں کو اسلام، یا عہد و پیمان، یا جنگ کا اختیار دیے بغیر داخل ہوا تو اہل سمرقند نے خلیفۃ المسلمین عمر بن عبدالعزیز کے پاس پیغام بھیجا اور اس میں شکایت کی کہ قتیبہ نے انھیں کسی چیز کا اختیار نہیں دیا۔ اگر وہ اختیار دیتے تو وہ کسی چیز کا انتخاب ضرور کرتے۔ اس پر پانچویں خلیفۂ راشد نے وہاں کے مسلمان قاضی (جج) کو پیغام بھیجا اور اس سے فرمایا کہ جوں ہی میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے، قتیبہ اور محاربین (برسرِ جنگ کفار) کو سامنے بٹھا کر ان سے حقیقتِ حال دریافت کرو، اگر اہل سمرقند کی شکایت درست ثابت ہو تو لشکر اسلام کو حکم دو کہ وہ یہ علاقہ خالی کر دے۔ قاضی نے اس مسئلے کی تحقیق کی اور یہ ثابت ہوگیا کہ قتیبہ بن مسلم نے فی الواقع انھیں یہ اختیار نہیں دیا تھا۔ قاضی نے فیصلہ صادر کیا کہ مسلمانوں کا لشکر سمرقند کو خالی کر دے، اور اہل سمرقند کو اختیار دیا جائے، چاہیں تو وہ اسلام قبول کرلیں، یا عہد و پیمان کرلیں، یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، چناں چہ لشکر شہر سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد اس کے باشندے معاہدہ کرنے پر رضا مند ہوگئے اور ان میں سے کچھ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔(۸۴)

کیا یہ حیرت انگیز رویہ عدلِ کامل کا اعلیٰ نمونہ نہیں ہے؟ مسلمانوں کا قاضی (جج) برسرِ جنگ کفار کو مسلمانوں کے سپہ سالار سے انصاف دلاتا ہے، پھر وہ لشکر اسلام کو شہر خالی کرنے کا حکم دیتا ہے جو مقامی باشندوں کو اسلام قبول کرنے، یا معاہدہ کرنے، یا جنگ کرنے کا اختیار دیے بغیر داخل ہوا تھا۔ سپہ سالار کا یہ اقدام ان پر ظلم کے مترادف تھا، جب کہ اسلام میں حالت صلح و جنگ میں عدل و انصاف پر مبنی قانون ہے۔ کیا آج کے اس تہذیب و تمدن اور قانون بین الممالک کے دور میں ایسی مثال ملنا ممکن ہے؟

پنجم۔ معاہدوں کا احترام اور ان کی پاسداری: معاہدوں کو اسلام میں ایک مقدس درجہ حاصل ہے، جس کی پابندی لازمی ہے، اس میں کوتاہی نا جائز ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی آیاتِ قرآنی ہے۔ ہم اختصار سے کام لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وأوفوا بعهدالله اذا عاهدتم ولاتنقضوا الأيمان بعد توكيدها وقد جعلتم الله عليكم كفيلا ان الله يعلم ما تفعلونo

---

(۸۴) النحل :۹۱-۹۲

☆ ثواب کا دارومدار نیت پر ہے ☆

ولاتکونوا کالتی نقضت غزلها من بعد قوة أنكاثا تتخذون ايمانكم دخلا بينكم أن تکون أمة هي أربى من أمة (اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر وفریب کا ہتھیار بناتے ہو، تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے)۔(۸۵)

یہ آیاتِ کریمہ معاہدے کے پاسداری اور اسے نہ توڑنے کو لازم قرار دیتی ہیں، معاہدوں میں مکر وفریب سے خبردار کرتی ہیں اور عہد و پیمان باندھ کر پھر اسے توڑنے والوں کو اس بیوقوف نادان عورت سے تشبیہ دیتی ہیں جو اپنی محنت سے پختہ سوت کاتتی ہے اور پھر خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ معاہدہ احمق اور بے وقوف لوگ ہی توڑتے ہیں۔(۸۶) یہ آیات بتاتی ہیں کہ زمین کے زیادہ حصے پر تسلط جمانے کی خواہش ہو، یا زیادہ طاقت ور بننے کا خبط، ان میں سے کوئی چیز بھی معاہدہ توڑنے کا جواز فراہم نہیں کرتی۔ اسلامی عدل ملکی مصلحت کو معاہدہ توڑنے کا سبب قرار نہیں دیتا، جب تک دشمن اس کی شرائط پر قائم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس صورت میں بھی نقضِ عہد سے خبردار کرتا ہے، جب مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں سے مدد طلب کر رہے ہوں کہ وہ ان کے ساتھ مل کر دین کے تحفظ کے لیے جہاد کریں، کیوں کہ ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے اور غیر مسلموں کے درمیان جو معاہدے ہیں، ان کا احترام کریں: وان استنصر و کم فی الدین فعلیکم النصر الاعلی قوم بینکم و بینهم میثاق (ہاں اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو)(۸۷)

معاہدوں کی پاسداری کے یہ انتہائی ٹھوس اور مبنی بر حقیقت اصول محض نظری اور خیالی

(۸۵) اسبوع الفقہ الاسلامی الثالث، ص ۱۹۹ (۸۶) سورۃ الانفال:۷۲

(۸۷) مجلۃ المسلمون، شوال ۱۳۷۲ھ ص ۲۳

نہیں ہیں، بلکہ ان کا مسلمانوں کی زندگی اور ان کے بین الممالک تعلقات سے واقعی اور عملی تعلق ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال وہ واقعہ ہے جو حضرت حذیفہؓ بن یمان سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں صرف اس وجہ سے جنگ بدر میں شرکت سے محروم رہا کہ میں اور ابوحسین جنگ کے لیے نکلے تو کفار قریش نے ہمیں پکڑ لیا اور کہنے لگے: ''یقیناً تم محمدؐ کے پاس جانا چاہتے ہو، ہم نے کہا: نہیں ہم تو مدینے جانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہم سے اللہ کا عہد لیا کہ ہم مدینے ہی جائیں گے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کریں گے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور انھیں اس واقعے کی خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم دونوں لوٹ جاؤ، ہم ان سے کیا ہوا عہد پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ سے مدد طلب کریں گے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابورافعؓ کہتے ہیں کہ قریش نے مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ جب میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو میرے دل میں اسلام گھر کر گیا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم: اب میں لوٹ کر کفار کے پاس نہیں جاؤں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں بدعہدی نہیں کرتا، میں تو ایک چادر کے سلسلے میں بھی بدعہدی نہیں کرتا، تم لوٹ جاؤ''۔(۸۸)

﴿۳۶۲﴾ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، جس طرح قانون بین الممالک کی وضاحت کی ہے اور فقہائے اسلام (جن میں امام محمد بن حسن شیبانی سرفہرست ہیں) نے اس پر گفتگو کی ہے، یہ اسلام کے قانون بین الممالک کے اصول کا اجمالی تعارف ہے، یہ وہ اصول ہیں جو امن و سلامتی، اتحاد و اتفاق، رحمت و عدل اور تحفظ فضیلت کے ضامن ہیں۔ تنہا یہی اصول پوری انسانیت کے لیے امن کی ضمانت ہیں۔ انسانی فکر قوانین اور نظامہائے سلطنت کے اعتبار سے کتنی ہی ترقی کر جائے، مگر وہ ان اصولوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ صبغة اللّٰه ومن احسن من اللّٰه صبغة و نحن له، عابدون (اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا! اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں)۔(۸۹)

---

(۸۸) سورۃ البقرۃ: ۱۳۸

(۸۹) القانون الدولی فی وقت السلم، حامد سلطان، ص ۴۲

(جاری ہے)